دورِ ''جدیدیت'' میں مغربی فکر و تہذیب

ایک ناقدانہ جائزہ

☆ ابوالحسن احمد
☆☆ ڈاکٹر فیض اللہ بغدادی

ABSTRACT

Western thinkers, in terms of the evolution of the human mind, have divided the Western Civilization into three periods historically. This article deals with the form and scope of Western Civilization and its thought in modernity, introducing Western religious, philosophical, scientific thoughts and the political system. In the West, Religion became a private matter due to the Secularism and other Philosophical thoughts like Humanism, Existentialism, Pragmatism, Utilitarianism, Empiricism and Positivism etc. During this time, movements such as Feminism dismantled the family system and the pursuit of selfish desires became commonplace and institutions of Western social order were also formed. Economic development in the West led to revolutions and the rise of military power led to the formation of Colonial Systems. Europe was embroiled in sectarian strife that perpetuated anti-Islamic sentiments, but the Jews took full advantage of Western modernity and with a wave of anti-Semitism, succeeded in swaying public opinion in favor of Zionism in the West. Western Nations took part in world wars for world domination, but the the Jews and US appear on victory stand.

Keywords: Anti-Semitism, Colonial Systems, Empiricism, Existentialism, Modernity, Philosophical, Feminism, Pragmatism, Religion, Secularism

مغرب اپنے شاندار دور کی ابتداء کو جدیدیت سے موسوم کرتا ہے جس کا باقاعدہ دورانیہ ۱۷۵۰ء تا ۱۹۵۰ء شمار ہوتا ہے۔ اس دور میں مادی پیداواری ذرائع میں انقلابی ترقی ہوئی، معاشرت میں زراعت کی بجائے سرمایہ داری کو فوقیت

☆ پی۔ ایچ۔ ڈی اسکالر، دی یونیورسٹی آف لاہور
☆☆ اسسٹنٹ پروفیسر، شعبہ عربی، منہاج یونیورسٹی، لاہور

ملی اور سماوی کتب کے شرعی قوانین کی جگہ لادینی قوانین کا نفاذ ہوا۔ مغربی تہذیب نے جدید دور میں اڑان بھری اور یورپ سے شمالی اور جنوبی امریکہ، آسٹریلیا اور باقی ممالک تک جا پہنچی۔ اس کی معاشی طاقت کسی بھی تہذیب سے بڑھ کر ہے اور اس نے سائنس و ٹیکنالوجی کے نظام سے ترقی کی عادت اپنائی۔ اس میں شخصی آزادی ایک قیمتی ورثہ قرار دیا جاتا ہے جس کا مغربی منہ کو لگا ہوا ذائقہ قدیم ثقافتوں سے مختلف ہے۔

چارلس جینکس اور دیگر مغربی مفکرین زمانی اعتبار سے سماجی ارتقاء کے تین ادوار قبل جدیدیت، جدیدیت اور مابعد جدیدیت شمار کرتے ہیں۔[1] ماقبل جدیدیت میں پاپائیت بطور دینی مقتدرہ چھائی رہی تاوقتیکہ نشاۃ ثانیۃ اور اصلاح دین کی تحریکیں انقلاب لائیں۔ جس کے نتیجے میں ۱۶۵۰ء کی دہائی سے ماقبل جدیدیت کی جگہ جدید ذہنیت غالب آگئی۔ ۱۹۵۰ء میں حالات پھر بدلے تو جدیدیت کو مابعد جدیدیت کے لیے میدان خالی کرنا پڑا۔

دورِ جدیدیت میں مغرب کے دینی افکار

مغربی فکر و تہذیب کی تمام تر ترقی تعلیم کے حصول سے شروع ہوئی جس میں بشریات نے دینیات پر وقعت پائی اور پھر اس کے نتیجے میں نئے نئے علوم و فنون کا پہیہ رواں دواں ہو گیا۔ علم کی حقیقی پیاس، فطرت کی تسخیر، افلاس، مرض اور جہالت پر قابو، سمجھ اور سیاست میں رائے عامہ کی وقعت مغربی تہذیب کے مثبت پہلو ہیں۔ لیکن لادینیت، جغرافیائی بنیاد پر قومیت، مغربی جمہوری نظام، دوہرا معیار، خود پسندی اور مادیت اس کے بظاہر چمکتے دمکتے لیکن منفی پہلو ہیں۔[2]

مغربی ہمہ گیر ترقی کا ناقدانہ جائزہ بتاتا ہے کہ خواہشاتِ نفس کی پیروی میں دینی اصولوں کے مکمل رد سے طاغوتی صف بندی میں شمولیت اس کا بنیادی سبب ہے اور مغربی دینداری جدیدیت کی راہ میں اپنے طرزِ کہن کی وجہ سے مزاحم نہ رہ سکی۔ تمام مغربی افکار نے مل کر ایسی تہذیب روشناس کرائی جس کا بنیادی نکتہ دین بیزاری تھا۔ مغرب کے بیش تر فلسفی سوشلسٹ اور کیمونسٹ رہنماؤں کی طرح مادیت پرست کہلانا پسند کرتے ہیں۔[3] مادیت پرستی مغربی معاشرے میں یوں رائج ہے کہ زندگی کی سب سے اہم قدر مادی کامیابی اور ترقی ہے۔

مغربی فکر میں انقلابی تبدیلیاں سیکولر نقطہ نظر کی حوصلہ افزائی کرتی رہیں جیسے چارلس ڈارون (م ۱۸۸۲ء) کے نظریہ ارتقاء کی وسیع قبولیت کا مطلب خالقِ کائنات کے تصور کے خاتمہ سمجھا گیا لیکن تحریف کی عادی دینداری اسے مسیحی

([1]) Charles Jencks, Critcal Modernism, where is post-modernism going? Wiley Academy, Englad. Page: 110

(۲) محمد عثمان، پروفیسر، (۱۹۷۷ء)، فکر اسلامی کی تشکیل نو، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور۔ ص ۱۵

(3) Lenin, Vladimir, (1947), Materialism and Empirio-Criticism: Critical Comments on a Reactionary Philosophy. Moscow. P:15

عقیدے میں ملاوٹ کر کے مغربی عالمی نظریہ میں شمولیت سے نہ روک سکی کیونکہ سائنس و عقل کے آگے ہتھیار ڈالتے ہوئے وہ زندگی کی ترقی میں ان کی وضاحت کو حرفِ آخر بننے سے نہ روک پائی تھی۔ جب کارل مارکس(۱۸۱۸ء تا ۱۸۸۳ء) نے معاشرے کا اچھوتے انداز سے تجزیہ کر کے نیا معاشی اور معاشرتی ڈھانچہ کھڑا کیا تو خدا بیزار سرمایہ داروں کو اس معبودِ حقیقی کی یاد ستانے لگی۔

جدیدیت کی ابتدائی دینداری کے مسلکی تنازعات نے تقسیم گہری کر دی تھی۔ مغربی تہذیب کے خطے مغربی یورپ میں مسیحیت کے دو مخالف کیمپ بن گئے تھے۔ اصلاحی تحریک کی برپا کردہ تقسیم سے شمالی یورپ کے بیشتر حصے پروٹسٹنٹ ازم کی فتح کا گن گا رہے تھے جبکہ رومن کیتھولک چرچ کی گرفت جنوبی یورپ پر ابھی تک استوار تھی۔ اصلاح پسندوں کا انفرادی روحانیت پر اصرار ذاتی انتخاب کی طرف بڑھ گیا تھا جس کی کوکھ سے سیکولر معاشرے نے جنم لیا جو مغربی تہذیب کی نمایاں خصوصیت ہے۔

دورِ جدیدیت میں مغربی فرقہ وارانہ تنازعات

مغربی تہذیب بیرونی نظر سے یکجان دکھائی دیتی ہے لیکن دور جدیدیت کا مطالعہ بتاتا ہے کہ مغرب میں تہذیبی و ثقافتی ہم آہنگی، دینی و مذہبی، قانونی، لسانی، انتظامی دستور کی یگانگت، زراعت اور زمینی ملکیت کے یکساں رواجات، وسیع پیمانوں پر باہمی روابط، قرابتداری اور خاص کر حکمرانوں کی باہمی رشتہ داری کے باوجود باہمی چپقلش کی حالت میں امن کا زمانہ ایک قاعدہ ہونے کی بجائے محض استثنیٰ تھا۔[1]

مغرب کی باہمی چپقلش کی کئی وجوہات میں سے مذہبی دبستانوں کی شدت پسندی اہم ترین تھی۔ سترہویں صدی میں کیتھولک اور پروٹسٹنٹ کے مابین وسیع علاقے میں بکثرت پر تشدد تنازعات ہوئے جنہوں نے یورپ کی عظیم بادشاہتوں کی بڑھتی ہوئی طاقت کی وجہ سے اس کو مزید پیچیدہ بنا دیا تھا۔ اس تنازعے کا اثر نوآبادیات میں مسیحی نشر واشاعت پر بھی پڑا۔

فرقہ وارانہ خلیج نے کئی دوسرے تعصبات کے ساتھ مل کر بدامنی میں اضافہ کیا جن کا دائرہ قومی سطح سے شروع ہو کر بین الممالک سطح تک پھیلتا چلا گیا جیسے ۱۶۱۸ء میں جرمن کیتھولک شہنشاہ کی پروٹسٹنٹ فرقے کے لوگوں کے خلاف کاروائیوں کی وجہ سے سکینڈے نیوین ممالک کے خلاف تیس سالہ جنگ کی ابتداء ہو گئی جس میں سیاسی وجوہات سے

([1]) Charles Tilly, (1975),The Formation of National States in Western Europe, Princton University Press, Princton.p: 18

فرانس بھی کود گیا۔ ۱۶۴۸ء میں مغربی فالیا کے صلح نامے سے اس جنگ کا خاتمہ ہوا تو جرمنی کی ساڑھے تین سو ریاستیں خود مختار ہو گئیں۔[۱]

مغرب میں فرقہ وارانہ اور اقتدار کی جنگیں ختم ہونے کا نام نہیں لیتی تھیں۔ دین و مذہب کو قصور وار ٹھہرانے والے دانشوروں نے لادینیت کے پروان چڑھنے پر بھی یہ منظر دیکھا۔ مذہبی آڑ میں بدامنی ختم ہوئی تو وجہ تنازعہ وطنیت اور اس سے جڑے دلکش حبِ وطن کے نظریے کے تحت بننے لگیں اور خاص طور پر انقلاب فرانس نے دینداری کے اختیارات لوگوں کو دے دیئے تو اس کے بعد سے ان جنگوں کا رخ اقوام کی باہمی چپقلش کی طرف پھر گیا۔[۲] ان جنگوں نے جنگ ہائے عظیم کا رخ اختیار کیا تو جدیدیت کے غبارے سے ہوا نکل گئی اور یورپ نے اتحاد کے بارے میں سنجیدگی سے سوچنا شروع کیا۔

دورِ جدیدیت میں مغرب کے فلسفیانہ افکار

دورِ جدیدیت میں فلسفیانہ ترقی نے سابقہ فلسفے کو مات دے دی نیز اٹھارہویں صدی میں تحریکِ تنویر اور تحریکِ رومانیت نے وحی اور علم لدنی کے بغیر استقرائی اور استخراجی عقل سے مابعد الطبیعیات کی طرح انسان اور کائنات کی حقیقت کے متعلق مسائل حل کرنے کے دعوے سے مسیحیت کو شکست دے دی۔[۳] جدید دین بیزار فلسفے کے چند بنیادی اور متاثر کن نظریات مختصراً یوں ہیں۔

بشریات کو فوقیت دینے سے انسانی فرد کے نقطہ نظر، مفادات اور مرکزیت سے وابستگی، انسان پرستی (Humanism) کے نام سے ابھری جس میں انسانی وجود کی خود مختاری پر یقین رکھا گیا اور تب عقیدہ ٹھہرا کہ عقل، تشکیک اور سائنسی طریقہ کار ہی حقیقت کو دریافت کرنے اور انسانی برادری کی تشکیل کے لئے موزوں وسائل ہیں نیز یہ کہ اخلاقیات اور معاشرے کی بنیاد خود مختاری اور اخلاقی مساوات میں پائی جانی چاہئے۔[۴]

موجودیت (Existentialism)، آخرت کے مقابلے میں دنیوی زندگی پر اصرار اور اس زندگی پر خدائی اقتدار کے خاتمے سے تعبیر ہے۔ وجودیت انفرادی تشخص کا ناگزیر حق ہے جس میں فرد کی مخصوص ضروریات پر اصرار کیا جاتا ہے اور انہیں معاشرے کی ضروریات پر فوقیت دی جاتی ہے۔ سورن کیر کیارڈ (۱۸۱۳ء تا ۱۸۵۵ء) کو عام طور پر

---

(۱) شاستری، چندر شیکھر، (س۔ن)، ہٹلر اعظم، شرکت الامتیاز، لاہور۔ ص ۱۵

(2) Huntington, William P, (1997), The Clash of Civilizations and the Remaking of World Order, Touchstone, New York. P:52

(۳) انصاری، جاوید اکبر، ڈاکٹر، (۲۰۰۲ء)، مغربی تہذیب، شیخ زائد اسلامک سنٹر جامعہ پنجاب، لاہور۔ ص ۴۹

(4) Concise Routledge Encyclopaedia of Philosophy, (1999), London: Routledge. P: 365

پہلا وجودی فلسفی سمجھا جاتا ہے جس نے تجویز پیش کی تھی کہ دین اور معاشرے کی بجائے ہر فرد زندگی کو معنی دینے، اس کو نیک جذبات اور خلوص نیت سے بسر کرنے یا اس کی سچائی کے بارے میں مکمل ذمہ دار ہے۔[۱]

امریکہ میں ایک صدی سے برپا انفرادیت بمقابلہ اجتماعیت کی بنیادی سیاسی کشمکش جاری ہے۔ فرد کی زندگی کا تعلق فرد سے ہے یا معاشرے سے؟ اب حکومت کی جانب سے عوام سے جمع کردہ رقم حقدار پروگراموں اور کارپوریٹ بیل آؤٹ پیکج پر خرچ کرنے سے اس مسئلے پر وضاحت کی ضرورت بڑھ گئی ہے۔ امریکی بانی رہنماؤں نے ملک تشکیل دیتے ہوئے اپنے اعلامیے اور آئین سازی کرتے ہوئے فرد کے حقوق کے تحفظ کی ضمانت دی تھی۔ انفرادیت کا نظریہ بتاتا ہے کہ فرد کی زندگی پر اس کا صوابدیدی حق ہے وہ جو چاہے فیصلہ کرے، اس پر عمل کرے اور اپنی کوشش کے ثمرات سمیٹے کیونکہ فرد خود مختار ہے۔[۲]

عملیت پسندی یا نتائجیت (Pragmatism) ایک فلسفیانہ تحریک ہے جس کے محرکین کا دعویٰ ہے کہ وہی نظریہ یا تجویز درست ہو سکتی ہے جو اطمینان بخش طریقے سے کام کرے اور اس کے معنی اس کو قبول کرنے کے عملی نتائج میں پائے جائیں۔ یہ نظریہ بتاتا ہے کہ علم نظری حد تک محدود رہنے کی بجائے اشیاء پر عملی طور پر استعمال کیا جانا چاہئے۔ ایک خیال واقعتاً تب ہی صحیح ہو سکتا ہے جب اس میں عملی استعداد ہو۔ پُر ذہانت کام صرف کھوج اور تلاش کرنے کی تحقیق نہیں بلکہ عمل کرنے کے لیے آگاہی کا نام ہے۔[۳]

افادیت پسندی (Utilitarianism) نتائجیت کی ایک شکل ہے جس میں مفاد کے حاصل کنندہ میں اخلاقیات کی ایک عجیب روایت ہے جس کے مطابق برے مقصد سے صحیح کام سرانجام پانا ممکن ہے اور اگر کوئی خوشی اور غلطی کو فروغ دے تو اس کا یہ عمل صحیح ہے۔ یہ نظریہ فرد کو اس کے مفادات کا تعاقب سکھاتا ہے چاہے دوسروں کی قیمت پر بھی اور اپنی اخلاقیات کے مطابق کسی فعل کو اپنے من پسند نتائج کے حصول میں آزادانہ طور پر درست یا غلط قرار دیتا ہے۔ اس نظریہ کے مطابق سب سے زیادہ اخلاقی انتخاب وہ ہے جو سب سے زیادہ تعداد میں سب سے زیادہ اچھا پیدا کرے۔ یہ واحد اخلاقی فریم ورک ہے جو فوجی طاقت یا جنگ کا جواز پیش کرنے کے لئے استعمال کیا جا سکتا ہے۔[۴]

([1])Walter Lowrie, (1969), Kierkegaard's attack upon Christendom, Princeton. P:37

([2]) Triandis, Harry, (1995),Individualism and Collectivism, Routledge, London, p:13

([3])Howard Mounce, (1995), The Two Pragmatisms, From Peirce to Rorty, Routledge Taylor and Francis Group, London.P:73

([4]) Frey, R. G, (1985),Utility and Rights, Blackwell, Oxford,P:31

دورِ جدیدیت میں مغرب کے سائنسی افکار

سولہویں صدی کے بعد پرنٹنگ پریس اور مارکیٹ کی معیشت کی ضروریات نے خواندگی میں اضافے کی حوصلہ افزائی کی اور پھر سائنسی انقلاب نے مذہب کی گرفت کو کم کیا اور ایک نئے انداز سے سوچنے کی آمادگی کی حوصلہ افزائی کی۔ انیسویں صدی نے اپنے تکنیکی شعبدوں کے ذریعے دنیا کو ایک حیرت انگیز نشاۃ ثانیہ عطا کی ہے جسے انسانیت کے مسائل حل کرنے میں استعمال کیا جاسکتا ہے۔[1] انسانی ہاتھوں سے ٹیلی گراف، بجلی، بھاپ، ریل روڈ اور دوسری ایجادات کو خدائی تخلیق کی تکمیل اور بہتری قرار دیا جاتا ہے۔[2] انسانی طور اطوار سے مشابہت دے کر خدا کے متعلق سمع وبصر، خندوحب، تدبیر وغضب جیسے تصورات بنا لیے گئے ہیں۔ جن کی نسبت انسانی خوبیاں کامل نہیں۔ اشیاء کے ظہور سے خدا کے متعلق گفتگو کرنا فطری فلسفے کا کام ہے۔[3]

سترہویں صدی میں بلند پایہ سائنسدان نیوٹن نے مادیت کی بنیاد پر ایک جامع میکانی نظریہ حیات مکمل کیا اور انیسویں صدی میں ڈارون نے مقبول و معروف نظریہ ارتقاء پیش کیا جس کا سائنسی مفروضہ تھا کہ قدیم زمانے کے عبوری دور میں انسان کے مورثِ اعلیٰ چار پایوں سے دوپایوں میں تبدیلی کے عمل کو قدرتی انتخاب یعنی جسم کے اعضاء کے کم یا زیادہ استعمال سے ورثہ میں حاصل کردہ اثرات سے مدد ملی ہوگی۔[4]

وحی الٰہی اور عقلِ انسانی کی بجائے حسی تجربے اورمشاہدے کی افادیت بڑھی جس سے حاصل ہونے والے علم کی فوقیت تجربیت (Empiricism) کہلائی۔ یہ نظریہ بتاتا ہے کہ حسی تجربہ ذریعہ علم ہے جو عقلی علمیات اور تشکیک سے لیس ہوکرالٰہیات اور بشریات کے عقائد میں سے ہے جس میں روایت کی بجائے تجرباتی ثبوت کے کردار کی اہمیت ہے تاہم روایت کو گذشتہ حسی تجربے سے تعلق کا استدلال کہا جا سکتا ہے۔ سائنس اور فلسفے کے اشتراک عمل سے ایک اور نظریہ متعارف ہوا جسے ایجابیت (Positivism) کہا گیا۔[5] مثبتیت کے فلسفیانہ نظام کی جڑیں سائنس اور ریاضی میں بہت عمیق ہیں۔ سائنسی پیشرفت اور مثبتیت پسندی حقیقت

([1]) Theodor Herzl, (1956), The Jewish State: An Attempt at a Modern Solution of the Jewish Question, trans: Berl Yocker, N. Newman, Tel Aviv, P:36

([2]) Bernhard Rieger, (2005), Technology and the Culture of Modernity in Britain and Germany, Cambridge University Press, Cambridge.P:76

(۳) آئزک نیوٹن، (۲۰۰۰ء)، ریاضیاتِ فطری فلسفہ، مترجم: خالد مسعود، مقتدرہ قومی زبان، اسلام آباد۔ ص ۵۲۷

(۴) چارلس ڈارون، (۱۹۹۹ء)، توریثِ آدم، مترجم: پروفیسر خادم علی ہاشمی ودیگر، مقتدرہ قومی زبان، اسلام آباد۔ ص ۳۷

(5) Stathis Psillos & Martin Curd, (2010), The Routledge companion to philosophy of science, Routledge, London.P:1, 129-38).

پسندی ہی ہے۔ اس عقیدے کے حامل معروضی سچائی پر ایمان رکھتے ہیں۔مثبتیت پسندی تمام بیانات کو سچ، جھوٹا، اور بے معنی کی تین اقسام میں تقسیم کرتی ہے۔[1]

دورِ جدیدیت میں مغربی نظامِ سیاست

جدیدیت کی ابتداء میں شاہی اختیارات مقدس تھے اور اس تقدیس نے یہ تصور راسخ کر دیا تھا کہ مطلق العنان اختیار کے بغیر نیکی کو پھیلایا اور برائی کو دبایا نہیں جا سکتا۔ اس سے حکمرانوں نے بڑے مزے اٹھائے کیونکہ سب کہتے تھے کہ بادشاہ کی طاقت ایسی ہونی چاہئے کہ کوئی بھی غلطی کر کے اس سے بچنے کی امید نہ کرے۔ لیکن اس کے برعکس بادشاہ کے اقتدار کے بارے میں یہی تصور تھا کہ اس پر کوئی حاکم نہیں جو اس کے غلط اقدامات کی اصلاح کرے۔ جب اسے معلوم ہو کہ اس نے برا کیا ہے تب ہی وہ خود کو درست کر سکتا ہے لیکن اس کے اختیارات اور اقدامات کے خلاف بعد میں کوئی علاج نہیں ہو سکتا۔[2]

جدیدیت نظامِ حکومت میں انقلابی تبدیلیاں لے کر آئی۔ بیشتر سیاسی نظریہ سازوں نے مطلق العنانیت کو شکست دی لیکن متبادل طرزِ حکومت نے سترہویں صدی کی مغربی سیاست کو پیچیدہ کر دیا جس کے اثرات اب تک برقرار ہیں۔ برطانیہ اور ہالینڈ نے پارلیمانی بادشاہی کا نظام تشکیل دیا جن میں کمزور مرکزی حکومتیں تھیں اور شاہی اقتدار پر قانون سازی کی توازن والی رکاوٹیں تھیں۔ جدید مغربی پارلیمنٹ میں تبدیلی سترہویں صدی میں شروع ہوئی تاہم جرمنی اور انگلینڈ کے اپنے مخصوص سیاسی نظام چند امتیازات کے ساتھ ۱۸۶۰ء کی دہائی تک سامنے آئے۔

شمالی امریکہ کی متعدد ریاستیں ۱۸۲۰ء کی دہائی تک جمہوری ہو گئی تھیں۔ ۱۹۲۰ء کی دہائی میں پارلیمانی جمہوریت نے جرمنی اور اٹلی میں گرفت پکڑی لیکن مشرقی اور وسطی یورپ میں سوائے چیکوسلواکیہ کے ناکام رہی۔ جدیدیت میں امریکی اور فرانسیسی انقلابات نے حالات کا رخ بدل دیا اور رائے دہی میں بتدریج توسیع ہوتی چلی گئی۔ تب ابھرتے ہوئے متوسط اور مزدور طبقات نے اشرافیہ اور بادشاہت کے سیاسی اقتدار میں اپنا حصہ وصول کرنا شروع کر دیا تھا۔ حق رائے دہی کی ابتداء محدود طبقے سے ہوئی تھی اور ابتدائی ووٹرز زمین کے مالک تھے یا ایسے ثروت مند جنہوں نے ٹیکس ادا کیا ہوتا تھا۔ انقلابی تجربے سے فرانس میں بالغ مردوں کی رائے دہی میں شرکت کی جلد توسیع ہو گئی۔ انیسویں صدی کے اختتام پر مغرب میں اخبارات کے اداریے، کالم یا تبصرے سیاسی حقوق میں توسیع کا پرچار کرنے لگے۔

([1]) 1. W. Carr and S. Kemmis, (1986), Becoming Critical: Education, Knowledge and Action Research, Falmer, London.P:67

2. Urmson, J. O, (1956), Philosophical Analysis, Oxford University Press, London.P:15

(2) Bossuet, Jacques-Benigne, (1990), Politics Drawn from the Very Words of Holy Scripture, trans: Patrick Riley, Cambridge.P:46, 83

جدیدیت میں اندرونی مسائل کے ساتھ مل کر ۱۷۸۹ء میں برپا ہونے والا فرانسیسی انقلاب ایک کرشمہ تھا جس سے موروثی بادشاہتوں کا سلسلہ ختم ہونا شروع ہوا۔ مطلق العنان بادشاہوں نے کلیسا کے اقتدار کے خاتمے میں حصہ ڈالا تھا تو اب ان کی باری تھی۔ عالمی تاریخ کے نامور جرنیلوں میں سے ایک، نپولین بوناپارٹ کے عروج نے اس بات کو یقینی بنایا کہ انقلابی فرانس نے کئی سالوں تک یورپ کے بیشتر علاقے پر تسلط قائم کیا، جس نے براعظم اور اس کے ارد گرد زیادہ موثر اور زیادہ مساوی حکومت پھیلائی۔ بالآخر ۱۸۱۵ء میں واٹرلو کی لڑائی میں نپولین (م ۱۸۲۱ء) کو شکست ہوئی لیکن وہ یورپی باشندوں کو ایک نئی قسم کی حکومت کے ذائقے سے آشناء کر گیا تھا۔

دورِ جدیدیت میں مغربی معاشرت

دور جدیدیت سے قبل مغربی ممالک کی بیرونی حد بندی نہیں کی گئی تھی جس کی وجہ سے ایک سماج سے دوسرے میں منتقلی پیچیدہ نہیں تھی۔ سولہویں صدی میں اس بات سے زیادہ فرق نہیں پڑتا تھا کہ کوئی شخص سرحد کے کس طرف رہتا ہے۔ لوگ آزادانہ طور پر نقل و حمل کرتے تھے اور ان کی بنیادی وفاداری گاؤں سے تھی۔ لیکن سترہویں صدی میں فرانسیسی اور ہسپانوی افراد کے درمیان امتیازات بڑھنے لگے جن کی وجہ سے بارڈر کی تشکیل شروع ہوئی۔ سرحدی امور کی نگرانی کے لیے مستقل طور پر نیم فوجی دستوں اور ان کی چوکیوں کی ضرورت محسوس کی گئی۔ ریاستوں کے ان مہنگے اقدامات کے نتیجے میں لوگوں کے لیے پہلے کی مانند حد بندی عبور کرنا زیادہ مشکل بنا دیا گیا۔

مغرب میں اقوام کی باہمی سیاسی تقسیم کی حد بندی نے انہیں غیر مغربی دنیا میں توسیع کی تلاش پر ابھارا۔ برطانیہ مغربی برادری میں ایک چھوٹی سی ریاست تھی جو اپنے پروٹسٹنٹ عقائد کے ساتھ بیسویں صدی تک بیرونِ یورپ مصروفِ عمل تھی۔ اس دوڑ میں اس کی فطری حریف مضبوط مرکزی ریاست فرانس اپنے قدیم کیتھولک مسلک سے جڑے ہوئے مقابلے کی دوڑ میں شامل تھی۔ ان سے الگ نظر آنے والا ملک جرمنی ان کی طرح اتنا ہی مغربی تھا جس نے بیرونی توسیع پسندی کا رستہ نہ پا کر برادری کے اندر توسیع کا سوچا تو فساد پھیل گیا۔

جدیدیت کی تشکیل میں پرنٹنگ پریس بہت بڑی پیشرفت تھی لیکن معیشت کی حقیقی تنظیم نو کے لئے زرعی ترقی ضروری تھی کیونکہ سترہویں صدی کے آخر تک دیہی معیشت تھی۔ ایک کسان کو زمین تیار کر کے بیج پھینکنے تک بہت تگ و دو کرنا پڑتی ہے۔ اس کے بعد اسے فصل کے پک کر کٹائی کے نفع تک پہنچنے کے لیے حالات کی سازگاری کے لیے آسمان کی طرف نظریں اٹھائے رکھنے کی ضرورت تھی جس سے دینداروں نے اور لٹیروں سے تحفظ کے لیے جاگیرداروں نے فائدہ اٹھا کر حصہ لینا شروع کیا۔ جن سے بالا ملوکیت نے سماجی حدود اور اجتماعی مفادات کی ضمانت کے نام پر انتظامی و دفاعی اخراجات میں اضافے کے احکامات دیئے تو ان کو پورا کرنے میں کسانوں کو حصہ نکالنا پڑا۔ اس سے کسان غلامی کے انداز

میں مزارعے بنتے چلے گئے تھے۔ مغرب میں عوامی شعور کی رفعت سے دورِ جدیدیت میں جاگیر داری دم توڑنے لگی تو اس کی ملوکیت اور پاپائیت سے مل کر تشکیل دی گئی ظالمانہ مثلث کا بالآخر خاتمہ ہوا۔[1]

سماج جاگیر داری سے صنعتی معیشت کی جانب بڑھا تو استحصال نے مزارعت سے محنت کا رخ کیا۔ کارخانے کے کارکن نے ابتداء سے آخری مرحلے تک پیداوار میں پسینہ بہایا۔ بیسویں صدی میں آتے آتے اسے محسوس ہونے لگا کہ نفع بخش پیداوار ایک ایسے فرحت بخش مشروب کی بوتل کی مانند ہے جس سے معزوز ہونے کے لیے وہ ایک بند کرنے والے ڈھکن جتنا حصہ لے سکتا ہے۔ اس استحصال کا مکمل خاتمہ سوشلزم میں دکھائی دیا تو اسے انسانیت کی معراج قرار دیا گیا۔ اشتراکی انقلاب مغربی تہذیب کے پڑوس میں ۱۹۱۷ء میں ابھرا تو سرمایہ دارانہ مغرب میں اس کے سدباب کے لیے مزدور دوست منشور لیے لیبر اور سوشلسٹ پارٹیاں بننے لگیں۔

دورِ جدیدیت میں خاندانی نظام اور حقوقِ نسواں

دور جدیدیت میں مغرب کے یورپی باشندوں نے ایک مخصوص نوعیت کا خاندانی ڈھانچہ تیار کرنا شروع کیا جسے مؤرخین نے صرف یورپی طرز کا خاندان قرار دیا ہے۔ جس میں نسبتاً دیر سے شادی کرنے، میاں بیوی اور بچوں کا جوہری کنبہ رکھنے اور دیگر رشتہ داروں سے کمزور خاندانی تعلقات برقرار رکھنے کی تین خصوصیات تھیں۔ ابتداء میں دولہا اور دلہن والدین کے معمر یا فوت ہونے پر ہی شادی کرتے تھے۔ ایک بڑی اقلیت نے شادی کرنا ترک کر دیا لیکن ابتداء میں سماج میں ان کی زناکاری کی حوصلہ شکنی کی جاتی تھی۔ شادی کے بعد جائیداد کی مناسب حصے سے وراثت کے لیے فی خاندان بچوں کی محدود تعداد اب اس نظام کا بنیادی مقصد نظر آتا ہے۔

سترہویں صدی تک پروٹسٹنٹ مصنفین نے اچھی شادی کے بندھن میں بندھنے کے لیے ازدواجی جوڑے میں محبت کی ضرورت اور پسند کی اہمیت پر بات شروع کی۔ پہلے اگر ایک عورت قسمت کا لکھا مان کر چپ ہو جاتی تھی تو جدیدیت نے عورت کو شعور دے دیا تھا جس نے ۱۶۰۰ء میں یہ استدلال شروع کیا کہ وہ والدین کے منتخب کردہ شریک حیات سے کبھی بھی محبت نہیں کر سکتی کیونکہ ایسی شادی محبت کی بنیاد پر نہیں بلکہ جائیداد کے انتظامات پر مبنی ہوتی تھی۔ ۱۷۵۰ء میں والدین نے بچی کی بات پر کان دھرنا اس لیے بھی شروع کیے کیونکہ قانون حرکت میں آنے لگا تھا۔ پروٹسٹنٹ اصلاحات سے شادی کے مروجہ تصور ایک دنیوی معاملہ بن کر حکومتی دائرہ کار میں چلا گیا۔ عورت کی رومانس میں اضافے کی کوشش اور محبت نے بڑھتی ہوئی صارفیت سے بھی تعامل کیا۔

---

(۱) مبارک علی، ڈاکٹر، (۲۰۱۲ء)، جاگیر داری، فکشن ہاؤس، لاہور۔ ص ۲۳

پروٹسٹنٹ روحانی وابستگی کی بجائے جوڑے کی ہم آہنگی کی ترجمانی کرنے لگے تھے۔ انہون نے شادی میں رکاوٹیں ہٹانا شروع کیں تو فرسٹ کزن کے رشتے میں شادی کرنے کو جائز قرار دیا۔ سترہویں صدی میں برطانوی پارلیمان سے شادی کو دین سے الگ تھلگ کرنے کا ایک ایکٹ منظور ہوا جس سے انگریزوں میں شادی ایک لادین امر بن گئی لیکن جلد ہی پرانا نظام بحال کر دیا گیا لیکن یہ مختصر وقت کا تجربہ امریکہ پہنچ کر راسخ ہو گیا۔

مغربی سائنس، جدید آرٹ، اور صارفیت نے دوبارہ قدم بڑھا دیے۔ ۱۹۲۰ء کی دہائی میں خواتین کے حالات میں متعدد تبدیلیاں آئیں۔ انیسویں صدی کے آخر میں خواتین کو طلاق کا قانونی تحفظ ملا اور مغربی حقوق نسواں کی غیر معمولی تحریک پر خواتین کو حق رائے دہی دیا گیا۔ خواتین کو تفریح اور عوامی سطح پر نمودار ہونے کی آزادی کے نئے مواقع حاصل ہوئے۔ ۱۹۲۰ء کی دہائی تک امریکہ، سکینڈے نیویا، برطانیہ، جرمنی، آسٹریلیا اور نیوزی لینڈ میں خواتین کو ووٹ ڈالنے کے حقوق مل چکے تھے۔ ۱۹۵۰ء کی دہائی میں شادی شدہ خواتین کو مزدوری میں واپس بھیجنے کا یکساں اور متوازی عمل جاری رہا۔

کیتھولک چرچ نے مجالس کے ذریعے پادری اور دو گواہوں کی موجودگی کے سابقہ احکام کی تصدیق کی اور خفیہ یا باہمی رضامندی کی ایسی غیر رسمی شادیاں ختم کر دیں جو بغیر باضابطہ تقریب کے جائز سمجھ لی جاتی تھیں۔ انگلینڈ میں ۱۷۵۳ء تک ایسی شادیاں ہوتی رہیں لیکن پھر چرچ آف انگلینڈ کو تمام شادیوں کا انچارج بنا دیا گیا۔ یہودیوں کو اس سے مستثنیٰ رکھا گیا اور نو آبادیات کو اس سے متاثر نہ کیا گیا۔ فرانسیسی انقلاب سے خانہ شادی متعارف کرائی گئی جسے اپنا لیا گیا۔

انیسویں صدی میں جرمن اٹھان میں اہم سیاسی کردار اداء کرنے والے نابغہ حکمران بسمارک(م) نے کیتھولک چرچ کے اثر ورسوخ کو کم کر دیا۔ وہاں مجسٹریٹ یا سرکاری اہلکار کی اس بارے میں تقدیم سے شادی خانہ آبادی کی ایسی رسم چلی جس نے مغربی دنیا کے بیشتر حصوں کو متاثر کیا جس کے نتیجے میں یہ شادی کی واحد جائز شکل بن گئی۔ اگرچہ ابھی بھی مذہبی رسومات کے مطابق شادیوں کی اجازت تھی لیکن ایسا سول تقریب ہونے کے بعد ہی ممکن رہنے دیا گیا۔

مغرب میں بین المسالک ایک اور فقہی مسئلہ طلاق کا نمودار ہوا۔ مسیحیت میں بندھے ازدواجی رشتے کے قطع کرنے کی ممانعت تھی۔ کیتھولک نظریہ کی مخالفت میں پروٹسٹنٹ اصلاح پسندوں کو یقین نہیں تھا کہ شادی شدہ زندگی قدیم مسئلہ کے مطابق ناقابل حل ہے اس لیے خاص حالات میں انہوں نے طلاق کے جواز کے حق میں رائے دی۔ آہستہ آہستہ یہ بات ذہن میں بیٹھ گئی کہ باہمی پیار کی کمی کے ساتھ شادی کرنا یا اسے جاری رکھنا ایک شرمناک بات تھی اور اسے تحلیل کرنا طلاق کے حق میں جواز بن گیا۔

دورِ جدیدیت میں مغرب کی معاشی ترقی

سرمایہ دارانہ معاشیات دولت کا ایسا علم ہے جس کا دوسرا نام مادی خوشحالی اور خواہشاتِ نفس کی کثرت اور ان کی تکمیل کی راہ تلاش کرنا ہے۔ اس کا آغاز اٹھارہویں صدی میں مغرب سے ہوا جس نے پوری دنیا کو اپنے زیر اثر کر لیا ہے۔اس جدید معاشیات کا بانی ایڈم اسمتھ(م۱۷۹۰ء) کہلاتا ہے جس کی معروف کتاب "The Wealth of Nation" نے گہرے اثرات مرتب کیے ہیں۔ اس کے زیر اثر انسان اپنے پروردگار سے منہ موڑ کر بغاوت پر اتر آیا ہے اور سرمائے کی دوڑ میں اس نے اقدار وضوابط کو فراموش کر دیا ہے۔

یورپ میں بادشاہت کے خلاف خطرہ بن جانے والے مرد آہن نپولین کی شکست میں ایک اہم حصہ برطانوی بحریہ نے ڈالا تھا۔ فرانس کے اس عظیم جرنیل کو اپنے ملک کے انقلاب پر ناز تھا تو اس کے حریف ملک برطانیہ کی معیشت ایک اور طرح کے انقلاب کی طرف گامزن ہو رہی تھی۔ نظریاتی سائنس کو ٹیکنالوجی کے عمل سے معیشت کے ساتھ مربوط کیا گیا تو اس کے نتائج اچھے نکلے۔ معاش کے زراعت پر انحصار میں کمی سے صنعتی انقلاب آنے لگا۔ برطانیہ میں اٹھارہویں صدی کے وسط کے بعد صنعت کاری کا رجحان تیزی سے عام ہونا شروع ہوا۔ میکانیکی آلات چلانے کے لیے بھاپ کی طاقت کے موثر استعمال کی وجہ سے کارخانوں میں بہت اضافہ ہوا۔ صدی ختم ہوتے ہوتے انگلینڈ اور اسکاٹ لینڈ کے قصبے بڑے ہونے لگے حتیٰ کہ وہ صنعتی علاقے بن گئے جن میں سینکڑوں فیکٹریاں کثیر مقدار میں تیار شدہ سامان کو جمع کرنے لگیں جن کی کھپت کے لیے حکومت نے منڈیاں تلاش کرنے کی حوصلہ افزائی کی۔

انیسویں صدی کے اوائل میں برطانوی معاشی توسیع نے شمالی امریکہ اور اندرونِ یورپ میں پھیلنا شروع کیا۔ نقل وحمل کے لئے بھاپ اور پھر بجلی کے استعمال نے اس رجحان کو مزید متحرک کیا۔ ریلوے نے پورے برطانیہ، یورپ اور شمالی امریکہ میں اپنا جال پھیلادیا۔ اس کے نتیجے میں انہوں نے ریاستہائے متحدہ امریکہ اور کینیڈا کے براعظم شمالی امریکہ کے خام اور تیار شدہ مواد کی تجارتی توسیع کا سوچا۔ ریلوے اور بندرگاہوں کے مربوط مواصلاتی نظام نے براعظم کی سمندری حد بندی کی اہمیت دوچند کر دی چنانچہ انیسویں صدی کے وسط تک یہ دونوں ممالک بحر الکاہل کے ساحل پر پہنچ چکے تھے۔

غلام ملاحوں کی جگہ بین البراعظم سمندری راستوں پر بھاپ کی توانائی سے چلنے والے بحری جہازوں سے نقل و حمل شروع ہو گئی۔ گوشت اور دیگر جلد خراب ہونے والی اشیاء کے تحفظ کے لیے ریفریجریشن کے استعمال نے ان کی سمندر پار ترسیل کو ممکن بنا دیا تھا۔ بحری مواصلات نے دنیا کو تجارتی راستوں کے ذریعے منسلک کر دیا تو معیشت اور تجارت کا عالمی پھیلاؤ ہوا جس سے سرمایہ دارانہ نظام جڑیں پکڑ گیا۔ اس نظام نے سرمایہ دار کو مراعات یافتہ طبقہ بنا دیا

جنہیں ہر جگہ سرمایہ کاری کے فروغ کے نام پر ساز گار حالات مہیا کیے گئے۔ سرمایہ داروں کے نفع کی لالچ میں آجر اور اجیر کے حقوق و فرائض میں توازن کی سرکاری نگرانی نظر انداز کی گئی۔

کوئلے کی توانائی یا جانداروں کی طاقت کی جگہ بجلی کے استعمال اور خودکار آلے بھاپ سے جوڑنے سے صنعتکاری نے مزید ترقی کی جس نے دنیا میں مغرب کی طاقت کو بہت بڑھا دیا۔ فیکٹریوں میں بھاپ سے چلنے والی مشینیں اور غیر ہنر مند مزدور ہنر مند کاریگروں کی جگہ لینے لگے۔ اس عرصے کے دوران لوگ دیہی علاقوں سے روزگار کی تلاش یا اعلیٰ معیار زندگی کے حصول کے لیے نقل مکانی کر رہے تھے۔ شہروں کی آبادی میں غیر معمولی اضافے کی وجہ سے لندن، پیرس اور نیویارک سیاسی قیادت مہیا کرنے لگے۔ لوگوں نے مشقت کی دیہی زندگی میں برادری کی جکڑ سے نجات پانے کا سوچا تو انہیں شہر شہرت، ثقافت اور ٹیکنالوجی کے نئے دارالحکومت نظر آئے۔ انہوں نے چمکتی دمکتی مصنوعی جنت میں اپنا بسیرا بنانے کے لئے دیہی علاقوں کو چھوڑ دیا۔ شہر نے انسان کو بہت سی شکست خوردہ قوتوں سے نجات دلا کر انسانیت کے مزے سے دوچار کر دیا تھا۔ شہر ایسی خوردبین ہیں جہاں جدید انسان پر تمام تر توجہ مرکوز ہے۔ انیسویں صدی میں بڑے پیمانے پر یورپ کو صنعتی شہروں کا درجہ ملا جہاں درمیانے طبقے کے معاشرتی اختلاط سے شہری مزدور طبقہ ابھرا۔ انقلابی معاشرتی تبدیلی سے شہر ظالمانہ مکاری سے گمشدہ لوگوں کا قبرستان بن گیا۔

انسانی سہولت کی ایجادات کا سلسلہ چل پڑا۔ مغرب میں الیکٹرونکس ایجادات اور ان کی بڑھتی پیداوار نے تہلکہ مچا دیا جیسا کہ کلائی پر پہننے کے لیے سوئس ایجاد کی چربہ گھڑیاں دھول، پانی یا جھٹکا برداشت کر سکتی تھیں جنہیں ہر کوئی نہیں کھول سکتا تھا۔ بیسویں صدی کے اوائل میں برقی روشنی، ٹیلی فون، ریڈیو، موٹر کار اور پھر ہوائی جہاز کی ایجاد نے اپنا اثر دکھانا شروع کیا۔ پیداواری شعبے میں ہنری فورڈ نے ترقی کی منازل طے کیں۔ اس مینوفیکچرنگ شعبے سے کارپوریٹ کلچر کی ابتداء ہوئی۔ تیل کے قدرتی وسائل کی ترقی نے اس کلچر میں جان ڈال دی لیکن جدیدیت کے آخر اور مابعد میں اس نے ایسے تنازعات اٹھائے کہ انسانیت کا اختتام نظر آنے لگا۔

سرمایہ دارانہ نظام معاشی نظام بن گیا تو لوگوں نے کرنسی مارکیٹ میں سرمایہ کاری کا خطرہ مول لیا۔ صنعت کاری سے سامان پیدا کرنے کی سستی اجرت کی مزدوری تھی۔ جن کے حقوق کے لیے مزدور یونینوں نے منظم ہونا شروع کیا۔ مزدوروں نے خود کو پسا ہوا طبقہ دیکھا تو حقوق کی جنگ لڑنے کے عزم کیے جانے لگے۔ سرمایہ دارانہ نظام کی جگہ کمیونسٹ اور سوشلسٹ نظریات کے منشور پیش کیے گئے۔ جن کی عملی تعبیر بالشویک انقلاب کی شکل میں ۱۹۱۷ء میں سامنے آئی۔

سوویت اشتراکی انقلاب دہریت کا علم اٹھائے ہوئے تھا جس کی جانب سے بیسویں صدی میں روسی آرتھوڈوکس چرچ کو ختم کرنے کی بالجبر کوششوں کے باوجود روس آج بھی قدامت پسند ہے۔ اس انقلابی فلسفے میں ایک نئی

طرز کی مادہ پرستی نے جنم لیا۔ تب مادیت پسندی، عینیت پسندی اور ان کے درمیان مختلف رنگوں کی لا ادریت فلسفیانہ مسائل تھے جن سے نئے نقطہ نظر کی تلاش بمع سود وصول کی جانے لگی تھی۔ اقدار اور لگان کے نئے نظریے بنائے جارہے تھے۔(۱)

دورِ جدیدیت میں مغرب کا نو آبادیاتی نظام

سترہویں صدی میں مغرب میں قومی استحکام، دولت اور خود مختاری میں اضافہ ہورہا تھا اور جب قومی حدود سخت کر دی گئیں تو فرانس، اسپین اور انگلینڈ جیسے ممالک کی باقاعدہ جغرافیائی تشکیل ہوئی۔ نو آبادیات کے دور میں یورپی طاقتوں نے اپنے مفادات کے لیے قدرتی وسائل اور لوگوں کو تقسیم کیا اور یوں ان کا استحصال کیا۔ افریقہ سے لوگوں کو غلام بنا کر ان کی تجارت کی گئی اور امریکہ کے مقامی لوگوں کو محکوم بنا کر جبری طور پر انہیں مسیحی بنایا گیا۔

براعظم آسٹریلیا کے ممالک آسٹریلیا اور نیوزی لینڈ اور شمالی امریکہ کے ممالک کینیڈا اور امریکہ اب مکمل مغربی تہذیب میں شامل ہیں۔ ان ممالک میں مقامی آبادی کے شکست کے بعد اجتماعی قتل اور بیماری کی وجہ سے وسیع پیمانے پر کمی ہوئی۔ یورپی آبادی کی بڑے پیمانے پر امیگریشن کی بنیاد پر یہاں مادی ترقی کو عروج ملا۔ نو آبادیاتی دور میں مغرب کی متحارب اقوام نے ہندوستانی، افریقی اور اسلامی تہذیبوں کے ممالک کو محکوم بنالیا اور امریکی انڈین تہذیبیں عملی طور پر ناپید کر دی گئیں۔(۲)

بحر اوقیانوس کے اس پار امریکہ کی توسیع کے نتیجے میں اس کے مختلف خطوں، خاص طور پر وسط میں جزائر غرب الہند اور جنوب میں تیسری دنیا کے معیار کی لاطینی آبادکار سوسائٹی پیدا ہوئی جس کے شمال میں امریکی و کینیڈیائی نسبتاً زیادہ صنعتی اور مساوات پسند معاشرے کے مابین فرق بڑھنے لگا۔ امریکیوں کے اپنے درمیان ۱۸۶۰ء کی دہائی کی ایک خونی خانہ جنگی ہوئی جس میں شمالی فتح کے ساتھ ہی دیس سے غلامی کا خاتمہ کر دیا گیا۔ اس خانہ جنگی کے بعد امریکہ میں غیر معمولی صنعتی توسیع ہوئی جس کے نتیجے میں انیسویں صدی کے آخر میں دولت مند بزنس ٹائیکون کی سربراہی میں بڑی بڑی کمپنیوں کا عروج دیکھا گیا۔

ہسپانویوں کے پہلے سفر کے وقت امریکی، نئے نام والے جزیرے، ہسپانیولہ کی مقامی آبادی تیس لاکھ تھی جن میں سے آج صرف دو سو بچ گئے ہیں۔ کیوبا اور دو دیگر بڑے، خوبصورت اور زرخیز جزیرے پورٹو ریکو اور جمیکا اس طرح تباہ کیے گئے کہ آج وہاں مقامی افراد میں سے کوئی ذی روح باقی نہیں۔(۳)

---

(۱) مارکس، اینگلس اور لینن، (۲۰۱۴ء)، جدلیاتی مادیت، مترجم: مرزا اشفاق بیگ، بک ٹائم، کراچی۔ ص ۲۲۱

(2) Hearnshaw, F. J. C, (1940), Sea Power of Empire, George Herrap and co; London.P: 179

(3) Nigel Griffin, (1992), A Short Account of the Destruction of the Indies, Harmondsworth. P:9

روسی سلطنت کے طاقتور بننے سے پہلے مشرقی قدامت پسند سر اٹھانے کے قابل نہیں تھے اور مغربی تہذیب کے مرکزی ممالک کی طرح ان کے توسیعی عزائم ممکن نہیں تھے۔ عربوں کے انخلاء کے بعد سپین نے نئی دنیا کی دریافت کی تو جنوبی امریکہ لاطینی امریکہ کہلایا جسے مسیحیت کے واضح طور پر مغربی ورژن میں تبدیل کر دیا گیا۔ یہاں لبرل ازم نے ۱۸۰۰ء کے بعد بحر اوقیانوس کی انقلابوں کی لہر میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا اور روشن خیالی کے فرانسیسی اور امریکی انقلابی سیاسی خیالات ہر طرف پھیل گئے۔ امریکی خطے میکسیکو اور پیرو میں زبردستی تبدیلی مذہب میں سوا لاکھ جانیں تلف کی گئیں جن کے آگے یورپ کو مسیحی بنانے کی خوفناک داستان اور سپین میں احتساب کی عدالت کی کوششیں ہیچ نظر آتی ہیں۔[1]

یورپی بری اور بحری افواج کے لیے دفاعی پیداوار کے شعبے میں صنعتی ترقی کی وجہ سے مشین گن، خار دار تاروں، خوفناک جنگی جہازوں، تارپیڈو، بارودی سرنگوں اور آبدوزوں کی اختراعات نے مغربی سلطنتوں کو مقابلے میں بہتر پوزیشن دی جس سے فائدہ اٹھاتے ہوئے وہ دنیا کے بیشتر حصے پر قابض ہوتی گئیں۔ مغربی تجارتی نیٹ ورکس نے اپنی قابض حکومتوں کی طرف سے دنیا بھر میں ریلوے کے پھیلاؤ کا بہتر استعمال کر کے دور دراز رسائی حاصل کی اور مقامی معیشتوں کو درہم برہم کر دیا۔

دورِ جدیدیت میں جنگ ہائے عظیم اور ان کے فاتحین

بیسویں صدی تاریخ کی سب سے پُر تشدد صدی تھی جس کے اوائل میں یورپی طاقتوں کے مابین دشمنی شدت اختیار کر گئی۔ اس صدی میں دو عالمی جنگیں، سرد جنگ، استعمار کا خاتمہ اور غاصب صہیونی ریاست کی عالمی پریشانیاں سامنے آئیں۔ یورپ معاشی ترقی میں عروج پر تھا کہ پہلی جنگ عظیم شروع ہو گئی جس نے عالمی معیشت کی حالت نازک کر دی۔ یورپی ممالک قرضدار ہو گئے جن پر امریکی قرض چڑھ گیا۔ ۱۹۲۹ء میں وال اسٹریٹ کریش کر گئی جس سے معاشی افسردگی پھیلی۔ بینک ختم ہو گئے، فیکٹریاں بند ہو گئیں، لاکھوں مزدور کام سے ہٹ گئے اور درمیانے طبقے کے خاندان اپنی بچت سے محروم ہو گئے۔ یہ بھیانک تنازعہ بنیادی طور پر یورپی سرزمین پر ہوا تھا اور اس کے نتیجے میں ایک کروڑ سے زیادہ افراد ہلاک ہوئے تھے۔ پہلی جنگ عظیم کے دوران جرمن مؤرخ نے مغرب کے انحطاط کی بات کی۔[2]

جرمنی اور اٹلی جیسے ممالک نے سامراجی طاقتوں کے گروپ میں دخل اندازی کی کوشش کی تو یہ جنگ شروع ہوئی تھی۔ شکست خوردہ یورپی طاقتوں جرمنی، آسٹریا اور عثمانی سلطنتوں کی بادشاہتوں کو معاہدہ وارسا اور دیگر معاہدوں

---

(1) Robert Briffault, (1930), Rational Evolution, The Macmillan Co. New York.P:117
(2) Oswald Spangler, (1926), Decline of West, Vol: 1, A.A. Knopf, NY.P:3

کے ذریعے نقشے سے مٹا دیا گیا۔ فاتح طاقتوں کی ابتدائی اتحادی طاقت روسی سلطنت کی جگہ سوویت یونین نے لے لی تھی۔ یورپ اور شمالی افریقہ کے ساتھ ساتھ، چین اور بحر الکاہل کے بڑے حصے جنگ کی ہولناکیوں کی ضد میں آئے۔

جاپان اور امریکہ کی سربراہی میں بیرونِ یورپ معاشروں نے جنگ سے فائدہ اٹھایا۔ جنگ کے بعد امریکہ سے آنے والے نئے ملبوساتی فیشن، جاز میوزک مقبول ہوئے اور جدید فن تعمیر مروج ہوا۔ ۱۹۲۰ء سے پہلے امریکہ روایات کے بھاری بوجھ سے پاک ایک نوزائیدہ قوم کی حیثیت سے سمجھا جاتا تھا۔ دوسرے الفاظ میں یہ ایسی جگہ تھی جہاں مغربی تہذیب کی اہم خصوصیات زیادہ نمایاں ہوئیں۔ انسانی تاریخ کا نیا جنم گویا مغرب میں ہوا ہے اور اب روشن خیالی کی مشعل امریکہ میں روشن ہو گی۔[1]

پہلی بار خواتین نے ووٹ دینے کا حق حاصل کیا اور تحریکِ نسواں کی امریکی پشت پناہی سے جنسوں کے مابین مساوات کی بات آگے بڑھی۔ بس پھر کیا تھا مقابلہ ہائے حسن کے انعقاد اور ساحلِ سمندر پر غسلِ آفتاب سے عریانی کا طوفان امڈ آیا۔ عورت خانہ داری سے بازار کی رونق بننے لگی تو مارکیٹنگ اور مال کی مشہوری میں اس کی اداکاری کے جوہر کھلے جن سے وہ فطری بندھن اور ذمہ داریوں سے آزاد ہونے لگی۔ ایسے اقدامات پاکس برٹانیکا سے پاکس امریکانا کی طرف اقتدار کی منتقلی کے کرشمے تھے۔

یورپ کے برے حالات میں فسطائی تحریکوں نے ابتدائی شکل اختیار کی اور جنگِ عظیم اول سے پہلے کے جدید معاشرے پر نئی قسم کے قدامت پسندانہ حملے شروع ہوئے۔ جرمنی میں ایڈولف ہٹلر کی نازی پارٹی ۱۹۳۲ء میں آزادانہ انتخابات میں عروج پر تھی جب سینتیس فی صد کے قریب ووٹرز نے اسے چن لیا۔ یورپ میں ابھرنے والی اس فسطائیت سے دوسری جنگ عظیم کا آغاز ہوا جس نے یورپ کی کمر توڑ کر رکھ دی۔ یورپی نو آبادیات میں آزادی کی ہلچل مچ گئی۔ روسی انقلاب ایک نئی طاقت بن کر خطرہ بن گیا۔

پرانی مقتدر طاقتیں پہلی جنگِ عظیم سے سنبھل رہی تھیں کہ دوسری جنگِ عظیم سر پر آ پہنچی۔ برطانیہ اور فرانس کے بیرون ملک معاشی مفادات کو اس جنگ نے ایسا دھچکا لگایا کہ یہ امریکہ کی زیر کمان چلی گئیں جس نے مغربی تہذیب میں نئے ثقافتی تاثرات پیدا کر دیئے تھے۔ برطانیہ کی نو آبادیات اس سے آزاد ہوئیں تو عالمی سیاسی دارالحکومت کی طرح دنیا کا مالیاتی مرکز امریکہ منتقل ہوا۔ انگریزی زبان کا عالمی غلبہ بہر حال وہاں بھی جاری رہا۔

دوسری جنگ عظیم کا خاتمے سے مغربی تہذیب کے سرمایہ دارانہ نظام نے نئی طرز کی نو آبادیات بنائیں۔ بین الاقوامی معاشی کنٹرول سے اقوام عالم کی غلامی کے تسلسل کے لیے ورلڈ بنک اور آئی ایم ایف کے ادارے بنائے گئے جو عالمی جنگوں کے مال غنیمت کے طور پر امریکہ نے حاصل کیے۔ اس نے جدیدیت کی نو آبادیات کا خاتمہ کرنے کی ٹھان لی

([1]) Klausner, Yosef, (1960), A History of Modern Hebrew Literature, Jerusalem: Ahiassaf. 4:281

تاکہ مابعد جدیدیت میں نئے ممالک کی منڈیاں اس کی مکمل دسترس میں ہوں جہاں سے قدرتی وسائل اور خام مال کی ترسیل آسان تر ہو۔

دورِ جدیدیت میں مغرب کی اسلام دشمنی

دور جدیدیت میں اسلام دشمنی کا سب بڑا اظہار علمی و تحقیقی انداز سے سامنے آیا۔ تحریکِ استشراق کے ذریعے یورپی تمدن کی برتری کا خیال اور مغربی شعور کے مطابق مشرق کا تصور عوام تک پہنچایا گیا جس سے مغربی ثقافتی بالادستی اور اس کی اثر پذیری کو استحکام ملا اور یہ نتائج تمدن میں رچ بس گئے۔ اس سے برے اثرات مرتب ہوئے جیسے مغربی تہذیب میں آرٹ کو اہمیت دی جاتی ہے۔ جب یہ فن مارکیٹ اکانومی کا حصہ بن گیا تو فنکار کے لیے فن پاروں کی نمائشیں کرنے کے انتظامات کیے جانے لگے اور آرٹ ذاتی اظہار رائے کے طور پر بھی دیکھا جانے لگا۔ یہ آزادی اظہار آج کل بڑھ کر توہین رسالت کے کارٹونوں کی صورت میں دوسروں کے لیے دل آزاری کا باعث بن گیا ہے حالانکہ جدیدیت نے جاتے جاتے ریاستی دستور کی تقدیس میں رخنہ اندازی اور قانون شکنی کے بارے میں آزادی کے حق کا استدال ماننے سے انکار کر دیا تھا۔ مغربی تہذیب کے کیتھولک اور پروٹسٹنٹ مسیحیوں اور صہیونی یہود کا اسلام دشمنی میں اتحاد ہے۔

خلافتِ راشدہ کے بعد مسلمانوں کی مضبوط ترین سیاسی اکائی قریشی خلافت تھی۔ صلیبی جنگوں کے دوران منگول حملوں کا نتیجے میں ۱۲۶۱ء میں اس کا خاتمہ ہوا۔ مشرق وسطیٰ میں شروع ہونے والے اس کثیر جہتی جمود سے یورپی پھیلاؤ شروع ہوا۔ صلیبی جنگوں نے مسلم مسیحی تعلقات میں وہ رخنہ ڈالا تھا کہ مفاہمت کی امید نہیں تھی۔ ترکوں نے خلافت سنبھالتے ہوئے دونوں دشمنوں کو پیچھے دھکیل دیا جن کے کمزور ہوتے ہی جنگ عظیم کے بعد یروشلم پر قبضہ کرتے ہوئے اپنی جیت کے نشے میں برطانوی لارڈ ایلن بائی نے صلیبی جنگوں کے خاتمے کا اعلان کیا۔ گذشتہ دو صدیوں سے سامراج اور مسلم دنیا مسلسل کشمکش کی حالت میں ہے۔[1]

مغرب کا ارضِ مقدس ہتھیانے کا خواب پورا ہونے میں ترک آڑے آرہے تھے۔ ۱۴۵۳ء میں ان کی فتحِ قسطنطنیہ نے مغربی تہذیب کو ہلا کر رکھ دیا تھا۔ اگرچہ اہلِ مغرب نے مشرقی آرتھوڈوکس کے بازنطینی بادشاہ کی امداد کے لیے کی جانے والی درخواستوں کو نظر انداز کیا تھا لیکن قسطنطنیہ میں مسیحیوں سے مسلمانوں کو کیا گیا انتقالِ اقتدار ان کا صدمہ پھر بھی بڑھا گیا تھا۔ اہلِ مغرب موقعے کی تاک میں تھے انہوں نے تجارت کے روایتی انداز سے ترکوں میں گھسنا شروع کیا۔ اٹھارہویں صدی میں ترکی کے ایک دانشور مرزا ابو طالب خان (م۱۸۰۶ء) نے استنبول کی تجارتی سبقت کے خاتمے سے متنبہ کیا۔ اس کے مطابق یورپ کی بری و بحری تازہ ترین معلومات کے حصول کی کاوشوں کا بنیادی مقصد

---

(۱) سید، محمد قطب شہید، (۱۹۹۳ء)، اسلام اور جدید ذہن کے شبہات، البدر پبلی کیشنز، لاہور۔ ص۹۔

تجارت میں سبقت کے لیے تھا۔ اس نے ان کی دیدہ دلیری کا یہ عالم بتایا تھا کہ وہ استنبول میں بلاروک ٹوک من مانی قیمتیں وصول کر رہے تھے۔ اس دانشور نے بروقت تجویز دی تھی کہ یمن کے سواحل فی الفور قبضہ میں لیے جائیں مبادا یورپی اقوام عالم اسلام پر تسلط جمالیں۔ (۱)

سامیت دشمنی سے صہیونیت نوازی کی طرف مغربی سفر

تھیوڈور ہرزل (م ۱۹۰۴ء) کی صہیونیت کے معمار مفکر کی حیثیت سے شہرت ہے۔ جس کا پیش کردہ صیہونی مدینہ فاضلہ کا نظریہ گویا انیسویں صدی کے سائنسی مسیحائی نظریہ پر مبنی تھا یعنی سائنس اور ٹیکنالوجی کی طاقت سے مغرب میں تضادات کو نپٹانے اور فلسطین میں صہیونی خیال کی عملی صورت گری اور نفاذ سے یہودی معاشرے کی تشکیل دینا مطلوب تھا۔ ہرزل کے ایک خط میں ہے کہ اگر خدا کی مرضی ہے کہ یہود اپنے تاریخی آبائی وطن کو لوٹیں تو انہیں مغربی تہذیب کے نمائندوں کی حیثیت سے مشرق کے طاعون زدہ کٹے ہوئے کونے میں مغرب کے نظامِ صفائی اور نظم وضبط سے رسم ورواج پر عملی کام کرنا پڑے گا۔ (۲)

زیادہ تر یہودیوں کا خیال تھا کہ یورپ میں ترقی ناگزیر ہے اور یہ قرون وسطیٰ کے اندھیرے میں واپس نہیں جائے گا۔ ۱۸۹۹ء میں باسل میں تیسری صہیونی کانگریس میں یقین ظاہر کیا گیا کہ مستقبل میں ہمارے ماضی کی تباہ کاریوں جیسا از سر نو حملہ کیا جائے گا۔ یورپ میں انسانی ضمیر کو ایمانداری کی ضرورت ہے جو ہنگاموں میں جرائم کی مخالفت کر سکے۔ (۳)

جدیدیت کے میلے کی چکاچوند میں یہود نے ابھی سکھ کا سانس نہیں لیا تھا کہ انہیں اپنا سنہری دور ستانے لگا جس کی بازیافت کے لیے انہوں نے صہیونیت کی تحریک کی داغ بیل ڈالی جس نے عملی اقدامات کے لیے مجالس کا انعقاد شروع کیا۔ یہودی قومی فنڈ کے ذریعہ شروع کردہ درخت فنڈ، فلسطین سے مغربی یہودی رابطوں کو فروغ دینے کے لئے شاید صہیونیت کا سب سے زیادہ ذہانت والا ذریعہ تھا۔ (۴) خیرات دینے کی یہودی روایت کو اس نے مسیحائی منصوبہ سازی میں

(1) Bernard Lewis, (1968), The Emergence of Turkey, Oxford University Press, London.P:28
(2) Theodor Herzl, (1960), The Complete Diaries of Theodor Herzl. Editer: Raphael Patai, Trans: Harry Zohn, Herzl Press, New York. 1:343
(3)Volkov, Shulamit, (2006), Germans, Jews, and Antisemites: Trials in Emancipation, Cambridge University Press, New York. P:28
(4) Michael Berkowitz, (1993), Zionist Culture and West European Jewry before the First World War, Cambridge U. Press, Cambridge. P:169

صرف کیا۔ مصادر سے اخذ نہ کرنے کے باوجود صہیونیت فلسطین کی مخصوص تصاویر کو مغربی یہودی شعور میں بسانے میں کامیاب رہی اس کے مراجع میں قابل اعتماد اعداد وشمار یا معاصر غیر صہیونی حوالے تھے۔(۱)

صحرا کو آباد کرنے کے دجالی منصوبے میں انہوں نے اپنے قومی درخت غرقد کو فراموش نہ کیا۔ عصر حاضر میں کارٹونوں اور فلموں کے ذریعے مستقبل کے منصوبوں کی جھلک دکھائی دیتی ہے۔ ماضی میں ناول اہم ترین ادبی تفریح تھی۔ یورپ میں پے در پے مجالس کے انعقاد نے صدیوں کی ہمسائیگی سے یہودی نفسیات کو سمجھنے والے چوکس ہوئے۔ انہیں صہیونی دانا بزرگوں کے سر جوڑنے کی تفصیلات ہاتھ لگیں تو یہود کی جانب سے عام اشاعت کے بارے میں بہانے تراشے جانے لگے۔ ایک جرمن یہودی صحافی نے پروٹوکول کا متن ہرمن گوڈشے کے ناول کا علمی سرقہ بتایا جس کا ایک منظر پراگ کے یہودی قبرستان میں تھا جہاں اسرائیل کے بارہ قبائل کے شہزادے اپنے دارالحکومت سے ایک یہودی مقدس شخص کی قبر پر جمع ہوئے تھے۔(۲)

عہد نامہ قدیم سے نسبت کا تفاخر یہود کو ان کے آباء کی طرح تحریف کے لیے مائل کرتا ہے۔ آخری نبی ﷺ کی آمد کی علامات کی معرفت سے وہ یثرب میں منتظر تھے اور اب وہ مسیحا کی آمد کی علامات پہچان کر فلسطین چلے آئے ہیں لیکن حسبِ سابق تسلیم کرنے کے لیے ان کی اپنی پیشگی شرائط ہیں کہ اگر کوئی مسیحا پیدا ہوا تو انہیں امید ہے کہ وہ گلیل کے صحرا کی بجائے بحیرہ طبریہ کے ضلع گلیلی میں اٹھے گا جہاں بجلی، گاڑیاں، صحت افزاء مکانات اور موٹر کشتیاں ہیں۔(۳)

یہود مغربی تہذیب کے اتنے خوگر تھے کہ خدا تعالیٰ سے ملنے کی آرزو میں بائبلی دور کا یہودی ماحول بناتے ہوئے انہیں جدیدیت کے وصالِ صنم کی بھی آرزو تھی۔ مشرقی شہر یاف "Jaffa" کے مقابلے میں ۱۹۱۷ء میں تل ابیب صرف کچھ چھوٹے محلوں پر مشتمل ایک جدید یورپی ماڈل کا مضافاتی شہر تھا۔ انہیں یہ امید تھی کہ صہیونیت فلسطین میں یہودی آبادکاری دمشق پر چمکتے ہوئے ایک یورپی بیکن میں بدل دے گی اور براعظم کی رگوں میں یورپی عبرانی ثقافت اہم سیاسی عنصر بن جائے گا۔(۴)

یہود کو دکھائی دیا کہ جرمنی نے پہلی عالمی جنگ کو نسلی جنگ کے طور پر لڑا تو وہ کیوں پیچھے رہیں۔ پولینڈ کے معاشرے میں یہودیوں سے کوئی خاص نفرت نہیں تھی جبکہ جرمنی میں عوامی سطح پر سامیت دشمنی جرمن ماں کے دودھ

(1) Michael Berkowitz, (1997), Western Jewry and the Zionist Project 1914-1933, Cambridge U. Press, Cambridge.P:123, 126

(2) Segel, Binjamin W, (1995), A Lie and a Libel: The History of the Protocols of the Elders of Zion, University of Nebraska Press, Lincoln.P:66

(3) Greenberg, Uri Zvi, (1927), Against ninety-nine, Sadan, Tel Aviv.P:33

(4) Greenberg, Uri Zvi, (1924), The Downfall of Jewry in Poland, Sadan.P:20–21

سے جذب ہونے والا ایک نفسیاتی ثقافتی رجحان ہے۔[1] جرمن سائنسی معجزے انجام دیتے ہیں انہوں نے گھڑی کو نسلوں پیچھے کی طرف موڑ دیا ہے جس سے ہم سب سیلاب کے وقت میں جی رہے ہیں۔ آج کل وہ یہودی کو سام اور "Gentile" یعنی غیر سامی قوم کو یافث کہتے ہیں۔ سام اور یافث کی واپسی سے اس دور کے رسوم ورواج بھی واپس آ گئے ہیں اور زمین پر تشدد کا ماحول بھر گیا ہے۔ غیر سامی سامیوں سے دشمنی رکھتے ہیں۔[2]

جنگِ عظیم میں ایک فریق یعنی جرمنی کی شہریت میں رہنے والے یہود کی مخالف فریق یعنی برطانیہ سے ساز باز کا ردِ عمل جرمنی میں ایدولف ہٹلر (م) کے انتخاب کی صورت میں سامنے آیا تو انہوں نے واویلا مچا دیا کہ اگر کسی عالمی جنگ کا آغاز ہوتا ہے تو یہ تباہ کن جنگ ہو گی جس میں ہٹلر کا کام سب سے پہلے یورپ کے یہودیوں کو ختم کرنا ہو گا[3] اور ایسا ہی ہوا کہ نازی رہنما نے ہولوکاسٹ، جس میں مبینہ طور پر ساٹھ لاکھ یہودی موت کے گھاٹ اتار دیئے گئے، کا تخریبی منصوبہ ترتیب دیا جس کے فاسد معمار ہنرچ ہیملر (م ۱۹۴۵ء) نے گیس چیمبر میں جاتے ہوئے ایک سنہرے بالوں اور نیلی آنکھوں والا لڑکے سے پوچھا کہ کیا وہ اور اس کے والدین یہودی ہیں؟ جب لڑکے نے مثبت جواب دیا تو اس نے کہا کہ افسوس! وہ اسے نہیں بچا سکتا۔[4]

یہود نے آسمان سر پر اٹھا لیا کہ ہٹلر یہودیوں کو روئے زمین سے مٹا دینا چاہتا ہے۔ جنگِ عظیم اول کے دوران معاشی طور پر بدحال عالمی طاقت برطانیہ کی مجبوری سے ہاتھ آنے والے موقعے کا انہوں نے فائدہ اٹھایا تھا تو اس کا منفی اثر بھی قبول کرنا ضروری تھا۔ پروٹسٹنٹ مسیحی صہیونیت نواز ہیں اور صہیونی یہود کو شکوہ ہے کہ کیتھولک ویٹی کن اب بھی ان سے معمول کے تعلقات نہیں چاہتا۔ پہلی عالمی جنگ سے قبل پاپائیت صہیونیت سے مستقل دشمنی رکھے ہوئے تھا۔ سفارتی دستاویزات سے پتہ چلتا ہے کہ عظیم طاقتوں اور صیہونیوں کے ساتھ تعلقات کے سلسلے میں اس کا بہت محدود کردار رہا بلکہ وہ تمام فریقوں سے متوازن چل رہا تھا۔ اس کے لیے صہیونی امنگوں کے مطابق پروٹسٹنٹ برطانوی اعلان اور مینڈیٹ پریشان کن تھا کیونکہ اسے یہودی ریاست سے دشمنی تھی۔[5]

۲ نومبر ۱۹۱۷ء کو برطانوی سکریٹری خارجہ آرتھر جیمز بالفور (م ۱۹۳۰ء) نے یہودیوں کے لیے فلسطین میں ایک قومی وطن کے قیام کے لیے برطانیہ کی حمایت کا خط صہیونی مالدار خاندان روتھ شیڈ کے افراد کو دیا تھا۔ اس اعلامیے

([1]) Zeev Jabotinsky, (1940), The Jewish War Front. Allen and Unwin, London.P:60–65
([2]) Robert Alter edt, (1975), Shem and Japheth on the Train, Trans: Walter Lever, Behrman, New York.P:26
([3]) Teveth, Kinat David, (1976), The Life of David Ben Gurion, Schocken, Jerusalem. 1:437–38
([4]) Mosse, George L, (1978), Towards the Final Solution: A History of European Racism, J.M. Dent and Sons London. P:221
([5]) Minerbi, Sergio, (1990), The Vatican and Zionism: Conflict in the Holy Land, 1895-1925 Studies in Jewish History, Oxford University Press, London.P:245

سے صیہونیوں میں پُرجوش امیدیں پیدا ہو گئیں گویا کہ عالمی صہیونی تنظیم کے مقاصد کی تکمیل ہو گئی تھی۔ برطانیہ نے سفارتی زبان میں فلسطین میں پہلے سے مقیم فلسطینی قوم کو طفل تسلیاں دیں اور پھر مئی ۱۹۳۹ء میں مقامی عربوں کی رضامندی کی شرط رکھتے ہوئے امیگریشن کے خاتمے کا وائٹ پیپر شائع کیا لیکن صہیونیوں نے برطانیہ پر عربوں کے طرفداری کا الزام عائد کرتے ہوئے نئی پالیسی کی مذمت کی۔ یہ نقطہ دوسری جنگ عظیم کے آغاز پر اٹھایا گیا تھا حتیٰ کہ ۱۹۴۸ میں ریاستِ اسرائیل قائم ہو گئی۔

برطانوی حکومت نے امید ظاہر کی تھی کہ یہ اعلان پہلی جنگ عظیم کے دوران مرکزی طاقتوں کے خلاف اتحادی طاقتوں کے شانہ بشانہ کھڑے ہونے میں امریکی یہودیوں کی رائے کو راغب کرے گا اور یہ کہ برطانوی حامی یہودی آبادی کے فلسطین میں تصفیہ سے پڑوسی ملک مصر میں نہر سویز تک پہنچنے والے راستوں کی حفاظت کی جاسکتی ہے اور اس طرح ہندوستان میں برطانوی نو آبادیاتی املاک تک مواصلاتی رابطے کو یقینی بنایا جاسکتا ہے۔

☆☆☆☆☆

مصادر و مراجع

۱. القرآن الکریم
۲. آئزک نیوٹن، (۲۰۰۰ء)، ریاضیاتِ فطری فلسفہ، مترجم: خالد مسعود، مقتدرہ قومی زبان، اسلام آباد
۳. انصاری، جاوید اکبر، ڈاکٹر، (۲۰۰۲ء)، مغربی تہذیب، شیخ زائد اسلامک سنٹر جامعہ پنجاب، لاہور
۴. چارلس ڈارون، (۱۹۹۹ء)، توریثِ آدم، مترجم: پروفیسر خادم علی ہاشمی و دیگر، مقتدرہ قومی زبان، اسلام آباد
۵. سید، محمد قطب شہید، (۱۹۹۳ء)، اسلام اور جدید ذہن کے شبہات، البدر پبلی کیشنز، لاہور۔
۶. شاستری، چندر شیکھر، (س۔ن)، ہٹلر اعظم، شرکت الامتیاز، لاہور۔
۷. مارکس، اینگلس اور لینن، (۲۰۱۴ء)، جدلیاتی مادیت، مترجم: مرزا اشفاق بیگ، بک ٹائم، کراچی
۸. مبارک علی، ڈاکٹر، (۲۰۱۲ء)، جاگیر داری، فکشن ہاؤس، لاہور
۹. محمد عثمان، پروفیسر، (۱۹۷۷ء)، فکر اسلامی کی تشکیل نو، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور۔
۱۰. مسلم، مسلم بن الحجاج القشیری، (۱۹۹۵ء)، الصحیح، مترجم: علامہ وحید الزماں، مشتاق بک کارنر، لاہور
11. Bernard Lewis, (1968), The Emergence of Turkey, Oxford University Press, London
12. Charles Tilly, (1975),The Formation of National States in Western Europe, Princton University Press, Princton
13. Concise Routledge Encyclopaedia of Philosophy, (1999), London: Routledge
14. Greenberg, Uri Zvi, (1924), The Downfall of Jewry in Poland, Sadan Zeev Jabotinsky, (1940), The Jewish War Front. Allen and Unwin, London.

15. Huntington, William P, (1997), The Clash of Civilizations and the Remaking of World Order, Touchstone, New York
16. Lenin, Vladimir, (1947), Materialism and Empirio-Criticism: Critical Comments on a Reactionary Philosophy. Moscow
17. Triandis, Harry, (1995),Individualism and Collectivism, Routledge, London
18. Howard Mounce, (1995), The Two Pragmatisms, From Peirce to Rorty, Routledge Taylor and Francis Group, London
19. Bernhard Rieger, (2005), Technology and the Culture of Modernity in Britain and Germany, Cambridge University Press, Cambridge
20. Stathis Psillos & Martin Curd, (2010), The Routledge companion to philosophy of science, Routledge, London.
21. W. Carr and S. Kemmis, (1986), Becoming Critical: Education, Knowledge and Action Research, Falmer, London
22. Urmson, J. O, (1956), Philosophical Analysis, Oxford University Press, London
23. Bossuet, Jacques-Benigne, (1990), Politics Drawn from the Very Words of Holy Scripture, trans: Patrick Riley, Cambridge
24. Klausner, Yosef, (1960), A History of Modern Hebrew Literature, Jerusalem: Ahiassaf.
25. Segel, Binjamin W, (1995), A Lie and a Libel: The History of the Protocols of the Elders of Zion, University of Nebraska Press, Lincoln
26. Klausner, Yosef, (1960), A History of Modern Hebrew Literature, Jerusalem: Ahiassaf.
27. Hearnshaw, F. J. C, (1940), Sea Power of Empire, George Herrap and co; London
28. Nigel Griffin, (1992), A Short Account of the Destruction of the Indies, Harmondsworth
29. Robert Briffault, (1930), Rational Evolution, The Macmillan Co. New York
30. Oswald Spangler, (1926), Decline of West, Vol: 1, A.A. Knopf
31. Theodor Herzl, (1960), The Complete Diaries of Theodor Herzl. Editer: Raphael Patai, Trans: Harry Zohn, Herzl Press, New York
32. Robert Alter edt, (1975), Shem and Japheth on the Train, Trans: Walter Lever, Behrman, New York
33. Teveth, Kinat David, (1976), The Life of David Ben Gurion, Schocken, Jerusalem.
34. Volkov, Shulamit, (2006), Germans, Jews, and Antisemites: Trials in Emancipation, Cambridge University Press, New York.
35. Mosse, George L, (1978), Towards the Final Solution: A History of European Racism, J.M. Dent and Sons London.
36. Minerbi, Sergio, (1990), The Vatican and Zionism: Conflict in the Holy Land, 1895-1925 Studies in Jewish History, Oxford University Press, London.P:245
37. Michael Berkowitz, (1997), Western Jewry and the Zionist Project 1914-1933, Cambridge U. Press, Cambridge
38. Michael Berkowitz, (1993), Zionist Culture and West European Jewry before the First World War, Cambridge U. Press, Cambridge.
39. Walter Lowrie, (1969), Kierkegaard's attack upon Christendom, Princeton